عالم انسانیت کو گاندھی جی کا پیغام

پروفیسر محمد مجیب

گاندھی جی کی ڈیڑھ سو سالہ تقریبات کے آغاز کے موقع پر اس کی اہمیت کے پیش نظر قارئین کے استفادے کے لیے پروفیسر محمد مجیب کا مضمون پیش کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

مجھے بڑے بڑے الفاظ اور بڑے بڑے دعوؤں سے ڈر لگتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ صحیح اور سچی بات وہی ہے جو سب کے لیے صحیح اور سچی ہو اور گاندھی جی سمجھتے تھے کہ انسان دوستی اہنسا اور ستیہ گرہ ایسے اصول ہیں، جن کا پرچار ساری دنیا میں کرنا چاہیے، لیکن مجھے یہ حق کسی طرح نہیں پہنچتا کہ گاندھی جی کا نمائندہ بن جاؤں اور عالم انسانیت کو ان کا پیغام اس انداز سے سناؤں کہ گویا میں خود اس پر عمل کر چکا ہوں یا اس کی گہرائیوں کو ناپ چکا ہوں اور اس لیے دوسروں کے سامنے اسے پیش کر رہا ہوں۔ پھر اس فرضی مخاطب، اس عالمِ انسانیت پر غور کیجیے کہ یہ کیا چیز ہے، اگر اس سے مراد دنیا ہے تو دنیا میں افراد ہیں، قومیں ہیں، خوف اور غرض اور ہوس کی کشمکش ہے، کہیں موت کا سا سکوت ہے، کہیں قیامت کے ہنگامے۔ دنیا میں وہ لوگ ہیں، جن کے کان اور دماغ اور دل بند ہیں، وہ جو نئی نئی باتیں سننے، نئے نئے تماشے دیکھنے کے شوقین ہیں، جن کے لیے ہر سنی ہوئی بات فوراً پرانی ہو جاتی ہے اور وہ جو نیک بات سُن کر ٹھنڈی سانس بھرتے ہیں اور پھر اپنے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔ اس دنیا کو مخاطب کرنے والا، اگر اس کی پشت پر دولت اور اقتدار، اخبار اور ریڈیو نہ ہوں، اپنے آپ کو کچھ اسی حالت میں پاتا ہے جیسی کہ لندن کے ہائڈ پارک کے ان مقرروں کی ہوتی ہے جو کسی کرسی یا بنچ یا لکڑی کے بکس پر کھڑے ہو کر بھاشن دیتے ہیں، سننے والے چاہتے ہوں یا نہ ہوں۔ اس تمہید کا مقصد یہ جتانا ہے کہ گاندھی جی کی شخصیت اور ان کی تعلیمات کا ذکر اس طرح نہ کرنا چاہیے کہ گویا ساری دنیا اسے سننے کے لیے تیار بیٹھی ہے اور ہمارا کام صرف ان تعلیمات کو بیان کر دینا ہے اور بس اور عالم انسانیت ساری دنیا کی آبادی نہیں ہے، اس آبادی کا کوئی منتخب حصّہ نہیں ہے، بلکہ وہ مجموعی نام ہے دل کی ان کیفیتوں کا جن میں انسان اپنی حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے اور ان ارادوں اور حوصلوں اور اس جدوجہد کا جو اس آگاہی کو ایک ظاہری سماجی شکل دیتی ہے۔ وہ لوگ جن کا ذہن اور عمل اس آگاہی سے متاثر ہوتا ہے خود بخود ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے مثال بنتے ہیں اور کامیابی کی اُمید ہو یا نہ ہو اس کوشش میں لگ جاتے ہیں کہ یہ دنیا سیاسی، معاشی اور سماجی طاقتوں کے تصادم کے بجائے محبت اور خیر خواہی کا میدان عمل بن جائے۔ اگر حق اور انصاف کے سچے احترام اور اپنے آپ کو ان کا خادم بنانے کے یہ ولولے عالم انسانیت مانے جائیں تو گاندھی جی کی ساری زندگی اور جدوجہد ایک پیغام معلوم ہوگی۔

ایک زمانے میں خیال عام تھا کہ ولی ماں کے پیٹ سے ولی پیدا ہوتا ہے، اس کے برخلاف قرآن کہتا ہے، **لیس للانسان الاماسعٰی** انسان کے لیے کچھ نہیں ہے سوا اس کے کہ جو کوشش سے اس کو ملے۔ گاندھی جی میں کوئی خاص خوبی نہیں تھی جو بچپن سے نمایاں ہو، وہ جو کچھ بنے، اپنی کوشش سے بنے اور یہ کوشش انھوں نے اپنے لڑکپن سے شروع کر دی۔ اس کا محرک خدا کا خوف تھا جو برے کاموں سے روکتا اور صحیح راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں آج کل یہ بات سمجھنا بہت مشکل ہے اس لیے کہ یہ خوف دلوں سے بالکل نکل گیا ہے۔ گاندھی جی کی ماں بڑی عبادت گزار اور دیندار تھیں، مگر اس زمانے میں کسی عورت کا پرارتھنا اور پوجا پاٹ میں مصروف رہنا کچھ غیر معمولی نہیں تھا۔ گاندھی جی کے والد فرض شناس اور دیانتدار تھے، پھر بھی ایسے نہیں کہ انھیں لاکھوں یا ہزاروں میں ایک کہا جا سکے۔ لڑکپن میں گاندھی جی کی صورت شکل، مزاج میں کوئی ایسی خوبی نہیں تھی جو اُن کی بعد کی عظمت کا پتہ دیتی، لیکن ماں باپ کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے، اپنی کسی حرکت سے اُن کا دل دکھانے کا خوف انھیں تھا، اور کبھی کبھی یہ خوف اتنا شدید ہو جاتا کہ وہ صحیح بات کہنے یا کرنے پر بالکل مجبور ہو جاتے۔

خدا کے خوف میں یہ تاثیر ہے کہ وہ ہر دوسرے خوف پر غالب آجاتا ہے، گاندھی جی جنوبی افریقہ گئے تو وہاں ریل کے پہلے سفر کے دوران ان کی

بڑی سخت توہین کی گئی۔ دوسرے ہندوستانی ایسی توہین کے ڈر سے ان قاعدوں کی پابندی کرتے تھے جو گوروں اور کالوں کو الگ رکھنے کے لیے بنائے گئے تھے۔ گاندھی جی کو یہ گوارا نہ ہوا، قاعدوں کو نہ ماننے میں جو جسمانی خطرے تھے ان سے کہیں زیادہ خطرناک وہ نتیجے تھے جو قاعدوں کو ماننے سے نکلتے تھے کہ یہ خطرے اخلاقی تھے، ان سے ڈر جانا گویا خدا کے ہوتے ہوئے شیطانی قاعدوں کے سامنے سر جھکانا تھا، لیکن یہ مناسب اور صحیح نہیں کہ ایک اکیلا آدمی اپنے لیے یہ طے کرلے کہ خدا کے حکم کی پیروی کس بات میں ہے اور کس بات میں نہیں اور لڑنے کے لیے میدان میں کود پڑے۔ گاندھی جی نے جب طے کیا کہ ایسے قاعدوں کی مخالفت کریں گے جن سے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی توہین ہوتی تھی تو انھوں نے اپنے خیالات بیان کیے۔ ہندوستانیوں کی خاصی بڑی جماعت کو قاعدوں کی خلاف ورزی پر آمادہ کیا اور اپنی صداقت کے امتحان کے لیے یہ شرط رکھی کہ تشدد کا مقابلہ عدم تشدد، اہنسا سے کیا جائے گا۔

اِس تحریک کی داستان سنانے کا یہ موقع نہیں، لیکن اسی سلسلہ میں گاندھی جی نے تمام مذہبوں کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب ایک دین کی مختلف شکلیں ہیں۔ حقیقت ایک ہے۔ قومی مزاج اور حالات نے اِسے بیان کرنے کے طریقوں میں فرق پیدا کردیا ہے، ظاہر ہے گاندھی جی کی اپنی زبان تھی۔ وہ خاص روایات اور اصولوں سے متاثر ہوئے تھے اور دین کی بنیادی باتوں کو اپنے خاص انداز سے بیان کرتے تھے، جو خدا کو مانتا ہے وہ اپنے آپ کو زنجیروں میں نہیں جکڑتا، اپنی روحانی اور اخلاقی طاقت کو عمل میں لانے کے لیے آزاد ہوجاتا ہے۔ اہنسا کے پرانے اصول کو گاندھی جی نے خیر خواہی کا اصول بنا دیا کہ جب تک انسان دل سے سب کا اور ہر حالت میں خیر خواہ نہ ہو وہ اہنسا برت نہیں سکتا۔ خیر خواہی عمل سے الگ کردی جائے تو وہ بے سود اور بے اثر ہوجاتی ہے، اِسے ایک ظاہری، سماجی شکل دینا لازمی ہے، اور یہی ہے بنیاد اس جدوجہد کی جس کے لیے گاندھی جی نے اپنی زندگی وقف کردی۔ انسانیت کا دوست انسان کا دشمن نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے گاندھی جی ہر قدم پر اپنی جانچ کرتے رہے کہ انھیں یقین ہوجائے کہ جس کی وہ مخالفت کررہے ہیں اِس سے صرف یہ نہیں کہ نفرت نہیں کرتے بلکہ اُسے دل سے عزیز رکھتے ہیں اور اس کی مخالفت اِس کی خیر خواہی میں اس کی اپنی بھلائی کے لیے کرتے ہیں۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ ایسے مسئلوں میں جو دراصل مذہبی نہیں ہیں خدا کا، دل کی آواز کا، اخلاق کا ذکر بیچ میں لے آتے ہیں۔ اگر غور کیجیے تو زندگی کا کون سا ایسا مسئلہ ملے گا جس کا کوئی اخلاقی پہلو نہ ہو۔ جس میں حق اور انصاف کی بات نہ آئے۔ گاندھی جی کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا اگر لوگ انھیں سنت اور مہاتما سمجھتے تھے اور اس لیے فرض کرلیتے تھے کہ وہ اصولاً حالات اور مصلحت اور متعلق لوگوں کے مزاج کو نظرانداز کرتے ہیں اور اب جب کہ کافی زمانہ گزر گیا ہے ہم ان اختلافات پر نظر ڈالیں جس کا آخری نتیجہ ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کا کشت وخون اور ملک کی تقسیم تھی تو ماننا پڑے گا کہ ہمیں اصل نقصان ایسی سیاست سے پہنچا جس کی پشت پر کوئی اخلاقی اصول نہ تھا۔

دراصل حق کا معیار اور ہے اور دنیا کا معیار اور۔ دنیا یہ دیکھتی ہے کہ کامیابی کتنی ہوئی۔ حق کے ترازو میں خلوص اور تمنا کی شدت کو تولا جاتا ہے۔ دنیا دیکھتی ہے کہ لیڈر کے ساتھ پیرو کتنے ہیں۔ حق کی جانچ میں دیکھا جاتا ہے کہ رہنما سب کا ساتھ چھٹ جانے پر بھی اپنے ارادے پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔ ۱۹۲۲ء میں چوری چورا کے بلوے کے بعد گاندھی جی کے سامنے یہ سوال تھا کہ وہ قوم کا ساتھ دیں گے یا عدم تشدد کے اصول کا، اور انھوں نے اصول کو ترجیح دی۔ اپنی اردو زبان میں ہم کہیں گے کہ خدا کے خوف نے انھیں اپنی تحریک کو بند کرنے اور کامیابی کو صداقت پر قربان کرنے پر مجبور کیا۔ یہ ایسی ہمت کی دلیل ہے جو اس دنیا میں بہت کم دیکھی جاتی ہے۔ پھر ۱۹۴۶ء کے فسادات کے زمانے کو دیکھئے۔ اس وقت کون تھا جس میں اتنی ہمت تھی کہ بھائی چارہ اور محبت کے نام سے انسانی ہمدردی کے جذبے پر بھروسا کرے اور کرائے۔ گاندھی جی نے اپنے آپ کو محبت اور ہمدردی کا علم بردار بنا لیا اور جہاں ضرورت ہوئی زخمی دلوں کی مرہم پٹی کرنے کو پہنچ گئے۔ جس وقت معلوم ہورہا تھا کہ شمالی ہندوستان کی آبادی کو لڑنے مرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں اور سیاسی رہنما یا ہمت ہار گئے تھے یا نفرت کی آگ بھڑکا رہے تھے گاندھی جی ایسی زبان میں جو الہامی زبان کی مثال رکھتی تھی قوم کو بتاتے رہے کہ ایک راستہ اور بھی ہے، اسی راستے کو بند کرنے کے لیے انھیں شہید کردیا گیا۔ ایسی شہادت حق پرستی کی معراج ہوتی ہے اور صداقت کے نور کو دل سے دل تک پہنچاتی ہے۔ شاید گاندھی جی کا پیغام یہی ہے کہ صداقت اور حق پرستی کے نور کو اپنے دلوں میں پیدا کرو۔ اسی کی روشنی میں زندگی کے مسائل کو دیکھو اور جو کچھ دیکھو اسے دوسروں کو دکھاتے رہو، یعنی صداقت کی روشنی کو پھیلاتے رہو۔

(بحوالہ: گاندھی جی اور ان کے خیالات،
مرتبہ عبداللطیف اعظمی، ناشر علمی ادارہ، جامعہ نگر، نئی دہلی)

◆◆◆